© rasailojaraid.com

رشید احمد جالندھری

سیرت طیبہ اور ہمارے مسائل

عرب معاشرے اور انسانی فکر پر قرآن مجید کے پیغام اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت طیبہ کے انمٹ نقوش کا اندازہ لگانے کے لیے ازبس ضروری ہے کہ ہم عہد جاہلیت کی زندگی کا جائزہ لیں۔(۱) اس طریق سے ہمیں اپنے موجودہ اجتماعی مسائل کا کوئی حل ڈھونڈنے میں بھی مدد ملے گی۔

مورخین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ قبل از اسلام عرب تاریخ کے افق پر ابھی تک دھند چھائی ہوئی ہے۔ اس عہد کی فکری اور اجتماعی زندگی سے آگاہ ہونے کے لیے ہمارے پاس مستند اور قطعی ماخذ قرآن مجید ہے اور اس کے علاوہ قدیم عرب شاعری، لیکن اس شاعری کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا کتنا حصہ اصلی ہے اور کتنا الحاقی، قدیم عرب تاریخ کا ایک ماخذ عہد نو میں ماہرین آثار قدیمہ کے بعض اثری انکشافات بھی ہیں، یہاں پہلا سوال یہ ہے کہ ہم عہد جاہلیت بول کر کیا مراد لیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ لفظ جاہلیت کا اصل جہل ہے، یہ لفظ علم کی ضد ہے، لیکن یہاں اس لفظ کی ضد علم نہیں ہے۔ بلکہ حلم ہے، یہاں جہل سے مراد غضب، حماقت، سفاہت ہے،(۲) یا یوں کہیے یہاں جاہلیت سے مراد وہ طرز فکر یا طرز زندگی ہے، جس کی بنیاد کسی آسمانی دین اور زندگی کی بلند قدروں پر نہیں ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید،(۳) حدیث پاک اور عرب شاعری میں بھی آیا ہے، ایک دفعہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک ساتھی پر طنز کیا تھا، تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : انک امرؤ فیک جاھلیہ، یعنی تم ایسے آدمی ہو جس میں (ابھی تک) جاہلیت باقی ہے۔ ایسے ہی عرب جاہلیت کے ایک معروف شاعر عمرو بن کلثوم نے اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہادری کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ :

الا لا یجھلن احد علینا

فنجھل فوق جھل الجاھلینا

خبردار ! کوئی ہمارے خلاف حملہ کرنے کی جہالت (حماقت) کا ارتکاب نہ کرے، جواب میں ہم اہل جہل کی جہالت سے بڑھ کر حماقت کا ارتکاب کریں گے۔

الغرض عہد جاہلیت کا اطلاق اس عہد پر کیا جاتا ہے جس سے اسلام کا واسطہ پڑا، جس میں دین کے اخلاقی تصورات کی بجائے قبائلی رسم و رواج اور طرز عمل کا سکہ چلتا تھا اور انسان کے سامنے زندگی کا کوئی بلند تصور نہیں تھا۔ عہد جاہلیت میں معاشرتی زندگی کا اندازہ اس روایت سے لگائیے جس میں کہا گیا ہے کہ ایک دفعہ عمرو بن اہتم نے حضرت عمر کی محفل میں احنف بن قیس سے کہا :۔ انا کنا وانتم فی دار جاھلیتہ، فکان الفضل فیھا لمن جھل، فسفکنا دماء کم و سبینا نساء کم وانا الیوم فی دار الاسلام و الفضل فیھا لمن حلم، فغفر اللہ لنا و لک، (۴) یعنی جب ہم دونو عہد جاہلیت میں تھے، اس وقت جاہل ہی صاحب عزت ہوتا، اور (جہالت یہ تھی) کہ ہم نے تمہارا خون بہایا، تمہاری عورتوں کو قیدی بنایا اور آج ہم دونوں اسلام کے گھر میں بیٹھے ہیں، آج صاحب عزت وہ ہے، جو بردبار ہے، پس خدا، ہمیں اور تمہیں معاف فرمائے،

پس یہ لفظ (جاہلیت) حلم (بردباری) کے مقابلہ میں بولا گیا ہے، یہ عین ممکن ہے کہ ایک آدمی نے سنگ و خشت کی عمارت میں بیٹھ کر کتاب کی سادہ ورق گردانی نہ کی ہو اور عرف عام میں ان پڑھ شمار ہوتا ہو، لیکن فطرت، تربیت اور تجربہ نے اسے دیدہ بینا عطا کی ہو، اور وہ خدا ترسی، صبر و تحمل، خدمت خلق جیسے بلند اخلاقی فضائل کا مالک ہو۔

اسلام سے پہلے عربوں کی دو نیم مختار حکومتیں شام اور عراق میں قائم تھیں، شام میں آل جفنہ حکمران تھے، جن کا صدر مقام دمشق سے قریب مقام جلق، جوللان تھا، پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں یہ خاندان حکمران بنا، یہ خاندان نہ صرف سیاسی طور پر رومی حکومت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے زیر اثر تھا، بلکہ اس نے عیسائیت کو بھی قبول کر لیا تھا، زبان ہر چند عربی تھی، لیکن بود و باش اور معاشرت رومی تھی، حضرت حسان بن ثابت اسلام سے پہلے ان امراء کے دربار میں جایا کرتے تھے، اسلام کے بعد حضرت حسان نے جلق میں بیتے ہوئے دنوں کی یاد میں شعر کہے ہیں، شام کے علاوہ عراق میں لخمی خاندان کی حکمرانی تھی، جن کا صدر مقام کوفہ سے چند میل کے فاصلہ پر "حیرہ" نامی مقام تھا۔ لخمی حکمران بت پرست تھے اور ایران کے زیر اثر، حیرہ میں ایک عیسائی جماعت بھی رہتی تھی جس کا عرب شاعری میں اپنا ایک مقام ہے۔ یہ شعراء عبادی شعراء کے نام سے معروف تھے۔

عبادی شاعری میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ بڑے موثر انداز میں کھینچا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وقت کے ہاتھوں کیسے کیسے ناموں کے نشان مٹے ہیں۔ انہی شعراء میں سے عدی بن زید ایک دفعہ حیرہ کے امیر نعمان بن منذر کی معیت میں شکار کے لیے نکلا، ایک درخت کے پاس سے گزرے تو عدی نے کہا، بادشاہا! کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ درخت کیا کہتا ہے؟ جی نہیں، نعمان نے کہا، تو عدی نے کہا کہ یہ درخت کہہ رہا ہے:-

رب رکب اناخوا عندنا : یشربون الخمر بالماء الزلال
عصف الدھر بھم فانقرضوا : و کذلک الدھر حالا بعد حال

یعنی کتنے ہی شاہ سوار ہیں جنہوں نے ہمارے پاس پڑاؤ کر کے ناؤ و نوش کی محفلیں جمائیں۔ زمانہ نے انہیں فنا کر دیا، ان کا نام و نشان مٹ گیا، زمانہ کی یہ روش برابر جاری ہے۔

ذرا آگے بڑھے تو دونوں کا گزر ایک قبر پر سے ہوا۔ عدی نے پھر نعمان سے کہا کہ کیا آپ قبر سے آنے والی آواز سن رہے ہیں، جو یہ کہہ رہی ہے:

ایھا الرکب المخبو : ن علی الارض المجدون
فکما انتم کنا : و کما نحن تکونون

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمین پر اترا اتر کر اور شان و شوکت سے چلنے والے سوارو،
جیسے تم ہو ہم بھی کبھی ایسے تھے، جیسے آج ہم ہیں، تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ گے۔

امیر نے شاعر سے پوچھا کہ کیا درخت یا قبریں بھی گویا ہوتی ہیں؟ اگر یہ ناصحانہ انداز میرے لیے ہے، تو بتائیے راہ نجات کیا ہے؟ بت پرستی کو ترک کر دو، خدا کی بندگی کرو اور حضرت مسیح کے دین میں آجاؤ، شاعر نے جواب میں کہا،(۵)

ان دونو حکمران خاندانوں کے باوجود حجاز کا معاشرہ مجموعی طور پر نہ تو روم و فارس سے متاثر تھا اور نہ ہی عیسائیت و یہودیت سے، وہ مجموعی طور پر بت پرست تھا اور اپنا قبائلی نظام رکھتا تھا، جو اس کی ساری وفاداریوں کا مرکز تھا، اہل مکہ اصحاب تجارت اور خانہ کعبہ کے پاسبان تھے، جس کی وجہ سے مالدار تھے، لیکن عام لوگوں کی زندگی بڑی تلخ تھی، وہ سخت کوشی اور جفا کشی سے عبارت تھی۔ فطرت سے ان کا قریبی تعلق تھا، اسی لیے ان کی شاعری تکلف یا تصنع سے پاک صاف تھی اور فطری حسن سے مالامال، ان کی شاعری سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ دوسری زندگی کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ ان کے ہاں زندگی کی آخری منزل قبر تھی، اس کے آگے انہیں کچھ نظر نہیں آتا تھا، وہ کہتے تھے کہ آدمی وقت کے ہاتھ میں کھلونا ہے۔ قرآن مجید نے ان کے خیالات کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اس امر پر تعجب کرتے کہ انسان مٹی میں گل سڑ جانے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ ہوں گے۔ ظاہر ہے جب زندگی کا یہ تصور ہو، تو پھر زندگی اپنی اہمیت اور تقدس کھو دیتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس معاشرہ میں بھی لوگ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ کیا یہ زندگی (جو وہ بسر کر رہے ہیں) زندگی کہے جانے کے مستحق ہے! جو اپنے سامنے کوئی مقصد یا نصب العین نہیں رکھتی۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت مکہ میں چند لوگ ایسے موجود تھے، جو بت پرستی اور پست اخلاق سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ مثلاً ورقہ بن نوفل نے عیسائیت کو قبول کر لیا تھا یا زید بن عمر، جنھوں نے عیسائیت یا یہودیت کو تو قبول نہیں کیا تھا، بت پرستی سے دور رہے، بتوں کے نام کی نذر و نیاز سے بھی، ایسے ہی آپ بچیوں کو زندہ درگور کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی مذمت کرتے، (۶) زید کہا کرتے : میں ابراہیم کے رب کی بندگی کرتا ہوں،
ان خدا پرست لوگوں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں غرضیکہ نزول قرآن اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب معاشرے کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا :-

۱۔ ان کے ذہن میں عمومی طور پر خدا کا کوئی واضح اور بلند تصور نہیں تھا، جو اس کی شان قدوسلیت سے مطابقت رکھتا ہو۔ 1

۲۔ وہ قبائلی نظام اخلاق رکھتے تھے۔ انتقام، خون ریزی، قبائلی عصبیت، ان کے ہاں فضیلت تصور کیے جاتے تھے۔ قتل و غارت پر فخر کرتے تھے۔ بے شبہ ان میں بعض زبردست اخلاقی خوبیاں بھی پائی جاتی تھیں، مثلاً مہمان نوازی، وفاداری اور بہادری، حاتم طائی کی جود وسخا اور سموئل بن عادیا کی وفاداری آج قدیم عرب تاریخ کا سنہرا باب ہے، ہمارے کلاسیکی ادب میں آیا ہے کہ ایک دفعہ حاتم طائی کی بیٹی ایک جنگ میں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ تو اس نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ وہ حاتم کی بیٹی ہے، جو مہمان نواز تھے اور بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کے غم خوار، تو آں حضرت نے فرمایا :-

"اس بچی کو چھوڑ دو، اس کا والد بلند اخلاق کا شیدائی تھا۔"

ایک طرف عرب سوسائٹی تھی، جو خدا کے بارے میں کوئی واضح اور بلند تصور نہیں رکھتی ہے۔ ہر چند وہ اللہ کا تصور رکھتی تھی، لیکن اس کی الوہیت میں مخلوق بھی شریک ہو گئی تھی۔ دوسری طرف ایران اور روم کی زوال پذیر سیاسی طاقتیں تھیں، جنھوں نے انسان کو اپنے استبدادی نظام میں بری طرح سے جکڑ لیا تھا۔ تیسری طرف یہودیت اور نصرانیت تھی، جن کے پاس انسانی روح کے قلق اور اضطراب کا اب کوئی موثر علاج نہ تھا۔ نزول قرآن کے وقت انسان کے فکری اور روحانی انحطاط کا ذکر کرتے ہوئے مغرب کے ایک معروف دانش مند پروفیسر آربری لکھتے ہیں :- ہمیں اس بات سے بخوبی آگاہ رہنا چاہے کہ قرآن ایسے وقت پر نازل ہوا جب یونانی اور رومی تہذیبیں مکمل طور پر مردہ ہو چکی تھیں۔ یہودیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور نصرانیت شکست خوردہ مذاہب کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ تعلیمات قرآن کا شکریہ کہ ان کی بدولت تاریخ میں عرب پہلی قوم ہے جو تہذیبوں کی حیات و ممات کے راز سے پوری طرح سے آگاہ ہوئی، نیا دین (اسلام) جو کسی معنی میں بھی نیا دین نہیں تھا۔ بلکہ اسی ابدی حقیقت کا نیا ظہور تھا جو ہمیشہ سے کائنات میں جلوہ گر رہی ہے اور جسے انسان نے اس لیے گم کر دیا تھا کہ وہ ماضی کی سنگین غلطیوں سے اجتناب کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے خدا کی مشیئت کے خلاف بغاوت کی تھی، نیز یہ کہ کائنات میں انسان کے مقام کو اس کے مغرورانہ احساس نے فراموش کر دیا تھا"(۷)

الغرض عرب معاشرہ مجموعی طور پر خدا کو فراموش کر چکا تھا اور جو لوگ فطرت کی کھلی ہوئی کتاب سے متاثر ہو کر خدا پر یقین رکھتے تھے۔ انہیں خدا تک پہنچنے کی راہ نہیں ملتی تھی۔ زید بن عمر کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ وہ بہ قول ابن ھشام کہا کرتے :۔لو انی اعلم ای الوجوہ احب الیک عبد تک بہ و لکنی لا اعلمہ۔ خدایا ! اگر مجھے علم ہوتا کہ کون سی راہ آپ کو زیادہ پسند ہے، تو میں اسی طریق سے تمہاری بندگی کرتا، (افسوس) مجھے اس کا علم نہیں، انسانی روح کی یہی بے سروسامانی تھی، جو خدا کی بے پایاں رحمت کی راہ تک رہی تھی، چنانچہ اس رحمت کا ظہور ہوا اور وہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وجود مسعود کی صورت میں جلوہ گر ہوئی اور یاس و حرساں کی تاریکی میں بھٹکی ہوئی انسانیت کو اپنی منزل کا سراغ مل گیا۔

رسول کریم نے اپنے غیر مہذب اور قبائلی معاشرے کو بدلنے کے لیے سب سے پہلے زندگی سے متعلق لوگوں کے تصورات کو بدلا اور بتایا کہ زندگی کا اصل سرچشمہ خدا کی ذات ہے، جس کی تخلیق کا شاہکار یہ کائنات اور انسان ہے۔ انسان ایک وقت تک زمین پر قیام کرے گا، موت کے بعد ایک نئی اور بہتر زندگی بسر کرے گا۔ البتہ اسے موت کے بعد اپنی دنیوی زندگی کی سرگرمیوں کا جواب دینا ہوگا۔ زندگی کی کامیابی یا ناکامی کا آخری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فیصلہ آج نہیں، کل کو ہونے والا ہے، جسے خدا نے "یوم الحساب" کہا ہے۔ قرآن مجید نے "یوم الحساب" کی ہولناکی کا نقشہ کھینچنے کے لیے جو اسلوب بیان اختیار کیا ہے، اس کی "آتش نفسی" کا صحیح اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں، جنہوں نے قرآن مجید کو اور خاص کر آخری پارے کو پڑھا ہے، آج ہم قرآن مجید کو پڑھ کر یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس ملکوتی نغمہ کو اہل مکہ نے پہلی بار سن کر اپنے دل و دماغ میں کس نئی صبح کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا قرآن مجید نے بتایا ہے کہ جن لوگوں نے رسول عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت سے منہ موڑا، وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر (جادوگر) کہتے تھے، یہ "کہنا" اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ قرآن مجید کی فصاحت اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو سحر آفرین شخصیت گردانتے تھے، لیکن ان کے پرانے رسم و رواج اور ذاتی مفاد ان کو قبول حق سے روکتے تھے۔ تاریخ نے ہمیں بتایا ہے کہ آخرت میں جواب دہی کے گہرے شعور نے انسان کو اپنی منزل سے بھٹکنے نہیں دیا، چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز خدا سے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو بحال کرنے سے کیا اور اپنی قوم کو بتایا کہ یہ اللہ ہی کی ذات ہے، جس سے تعلق قائم کیے بغیر انسانی روح کو قرار نہیں ملے گا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی دعا میں فرمایا کرتے :-

اللھم انت السلام و منک السلام و الیک یرجع السلام، خدایا! تو ہی السلام ہے اور تجھی سے امن و آشتی کا سرچشمہ پھوٹتا ہے، چنانچہ خدا سے قریبی تعلق اور قیامت میں باز پرس کے گہرے احساس نے زندگی سے متعلق اہل مکہ کے مادی نقطۂ نظر کو بدل دیا، اس دعوت کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ خالق سے لو لگانے کے بعد اس کی مخلوق کی خدمت کی جائے، کیونکہ سارے انسان، خواہ وہ کسی رنگ، نسل، زبان سے ہوں، آدم کی اولاد ہیں، رنگ، زبان، اور قبیلوں کا اختلاف، دراصل ایک ہی وحدت کے مختلف مظاہر ہیں اور خدا کے عطیے، لیکن انسانوں میں خدا سے قریب تر وہی ہے، جو سب سے زیادہ متقی ہے اور "متقی" کی تعریف کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے کہ "جو لوگ خدا کی محبت کی راہ میں اپنا مال، رشتہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سائلوں کو دیتے ہیں، غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوۃ ادا کرتے ہیں، اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں، جب قول و قرار کر لیتے ہیں، تو اسے پورا کر کے رہتے ہیں، تنگی اور مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت، ہر حال میں صبر کرنے والے (اور اپنی راہ میں) ثابت قدم ہوتے ہیں، تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں، جو نیکی کی راہ میں سچے ہوئے اور یہی ہیں جو "متقی" ہیں (سورۃ بقرہ: ۱۷۷)

ان آیات کریمہ سے واضح ہے کہ تقوی اور متقی کے معانی میں خدا پر یقین رکھنے کے بعد خدمت خلق کرنا بھی شامل ہے، یہی تعلیم سورۃ الفجر، سورۃ البلد، سورۃ الماعون میں دی گئی ہے کہ مشکل وقت میں لوگوں کو کھانا کھلانا، قریبی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنا اور خاک بسر مسکین کی ضرورت کو پورا کرنا، غلامی کی زنجیر میں جکڑی ہوئی گردن کو آزاد کرنا، غرضیکہ سوسائٹی کے نادار طبقہ کی معاشی امداد کرنا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا دوسرا بنیادی رکن ہے اور جو ایسا نہیں کرتا، اس کے اس رویہ کو قرآن نے تکذیب دین سے تعبیر کیا ہے، شیخ محمد عبدہ نے اس سورت (الماعون) کی عمدہ تفسیر و تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو لوگ دین سے زبانی وفاداری کا دعوی کرتے ہیں اور عملاً ان کا دوسرا رویہ ہے اور سوسائٹی کے نادار اور کمزور طبقہ کی دست گیری نہیں کرتے، وہ عملاً دین کو جھٹلا رہے ہیں، خواہ وہ کسی بھی دین کی طرف اپنی نسبت کا زبانی اعلان کریں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے قریبی ساتھیوں نے انسانی وقار کو بحال کرنے کے لیے معاشرے کے مظلوم طبقہ کو اخلاقی اور قانونی سہارا دیا۔ معاشی انصاف کو قائم کرنے کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں نے اپنے قول و عمل سے جو شاندار روایات قائم کی ہیں، ان کے پیش نظر طہ حسین نے لکھا ہے کہ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریش کو جو آں حضرت صلی اللہ علیہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وسلم سے سخت رنجیدہ تھے۔صرف توحید ہی کی دعوت دیتے اور ان کے (ظالمانہ) اجتماعی اور اقتصادی نظام کو اپنے حال پر چھوڑ دیتے، آقا و غلام، فقیر و غنی اور زبردست اور زیر دست میں مساوات قائم نہ کرتے اور ان کے سودی نظام کو منسوخ نہ کرتے، غرضیکہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ظالمانہ اجتماعی نظام کو نہ چھیڑتے تو قریش کی اکثریت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لے آتی۔اور توحید کو مان لیتی۔اس لیے کہ قریش اپنے بتوں سے بھی مخلص نہیں تھے۔انھوں نے اپنے مالی مفاد اور عربوں کے مالی استحصال کے لیے بتوں کی پناہ لے رکھی تھی۔(۸)

غرضیکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب معاشرے کی "فکری" اور عملی گمراہیوں کو فکری سطح پر بے بنیاد قرار دینے کے بعد لوگوں کی فکر کو بدلا اور ظالمانہ اجتماعی نظام کو بدلنے کے لیے عملی قدم اٹھائے اور اس طریق سے صدیوں کے فاسد رسم و رواج اور توہمات میں گرفتار معاشرے کے سامنے آزادی کی راہ کھول دی، قرآن مجید نے اس تاریخی انقلاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا ہے :- "(آپ لوگوں کو) اس بوجھ سے نجات دلائیں گے، جس کے تلے (یہ لوگ) دبے ہوں گے، ان پھندوں سے نکالیں گے، جن میں (لوگ) گرفتار ہوں گے۔" (سورۃ اعراف آیت نمبر ۱۵۷)

یہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی ایک خصوصیت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ انسانوں کو اس "بوجھ" اور "پھندوں" سے نجات دلائیں گے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔یہ "بوجھ" اور یہ "پھندے" کیا تھے؟ بلاشبہ یہ فاسد اور بوجھل عقائد تھے، جن کا طوق لوگوں نے اپنے گلے میں پہن لیا تھا اور تقلید و جمود کی وہ زنجیریں تھیں، جن میں انھوں نے دین و دانش کو جکڑ رکھا تھا۔ابوالکلام آزاد اس "بوجھ" اور "پھندوں" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"مذہبی احکام کی بے جا سختیاں، مذہبی زندگی کی ناقابل عمل پابندیاں، ناقابل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، عالموں اور فقیہوں کی تقلید کی بیڑیاں، پیشواؤں کے تعبد کی زنجیریں، یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں، جنہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے دل و دماغ مقید کر دیے تھے۔ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت نے ان سب سے نجات دلائی۔ اس نے سچائی کی ایسی سہل و آساں راہ دکھا دی، جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں، عمل کے لیے کوئی سختی نہیں .... افسوس! جن پھندوں سے قرآن نے اہل کتاب کو نجات دلائی تھی، مسلمانوں نے وہی پھندے پھر اپنے گلوں میں ڈال لیے ہیں

(ترجمان القرآن، سورۃ اعراف، ۱۵۷)

رسول کریم ایک صبر آزما پیغمبرانہ جدوجہد، حکمت و بصیرت اور اپنی اجلی اور پاکیزہ زندگی کے بل پر زندگی سے متعلق عربوں کے صدیوں پرانے نقطۂ نظر کو بدلنے میں کامیاب ہو گئے، اب ان کی اخلاقی زندگی میں انتقام کی بجائے عفو و کرم، غرور نفس کی جگہ عجز و انکساری، قتل و غارت کی جگہ امن و آشتی اور خدمت خلق زندگی کی بلند قدریں شمار ہونے لگیں، اور ایک خدا کی بندگی اور آخرت میں جواب دہی کے گہرے شعور نے ان کی زندگی کو معنویت عطا کی اور وہ اپنے پندار کے صنم کدہ کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں آ رہے ہیں اور زندگی نے اپنا پرانا لباس اتار کر ایک نیا اجلا لباس پہن لیا ہے، اب وہ چند متحارب اور جنگ جو قبائل کی سطح سے بلند ہو کر ایک قوم، ملت اور جماعت بن گئے ہیں۔ آپ نے اجتماعی زندگی میں خون ریزی کو روکنے اور قیام امن کے لیے اہل مکہ اور دوسری قوموں سے معاہدے بھی کیے۔ یہ معاہدے صحیح معنی میں اخوت، عدل و انصاف، پیغمبرانہ سیاسی بصیرت اور اسوۂ حسنہ کا بہترین نمونہ ہیں، جو نفرت، انتقام اور انسانی توہین کے ہر شر سے پاک ہیں، قیام امن سے متعلق آپ کی حکیمانہ سیاست کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ جب سنہ ۸ ہجری میں آپ مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو آپ کے سامنے وہ لوگ آئے جنہوں نے آپ اور آپ کے جانثار ساتھیوں کو برابر تیرہ سال تک ستایا تھا، لیکن جونہی یہ لوگ ایک شکست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خوردہ قوم کی حیثیت سے آپ کے سامنے آئے تو آپ نے فرمایا کہ میں تم سے وہی سلوک کرنے والا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا، حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا کہ "آج کے دن (میری جانب سے) تم پر کوئی سرزنش نہیں، اللہ تمہارا قصور معاف فرمائے، وہ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔" (سورہ یوسف ۹۲) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا کہ جاؤ! تم سب لوگ آزاد ہو، "اذهبوا فانتم الطلقاء"

آئیے ایک دوسرے معاہدے کا مطالعہ کریں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کی ایک عیسائی جماعت سے ایک معاہدہ فرمایا، جس میں یہ دفعات شامل تھیں:-

۱۔ ہر گز ہر گز ان کو (عیسائیوں) رسوا نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ انہیں فوجی خدمات سرانجام دینے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ ان پر صرف عدل و انصاف کی حکمرانی ہو گی۔

۴۔ ان کا مال و دولت، ان کا مذہب اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی جائے گی۔(۹)

قرآن مجید کی تعلیمات اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ نے اس بات کو واضح کر دیا کہ جنگ اور خون ریزی سے بچنے کے لیے، مسلمان دوسری قوموں سے امن کا معاہدہ کر سکتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ انسان کو "پر امن بقائے باہمی" کا پہلا قانونی اور موثر درس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہو گا کہ مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات بنیادی طور پر جنگ پر نہیں، امن پر مبنی ہیں۔ جنگ صرف ایک عارضی صورت ہے، جسے صرف اس وقت روا رکھا گیا ہے جب مسلمان جارحیت کا شکار بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام ابن حنبل اور دوسرے فقہا کے ہاں جنگ کا سبب کفر یا اسلام کا انکار نہیں، بلکہ جارحیت ہے، دوسرے یہ کہ جنگ کا مقصد جارحیت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فتنہ و فساد کو روکنا ہے، تیسرے یہ کہ مسلمان دوسری امن پسند قوموں کے ساتھ امن اور نا جنگ معاہدے (No War Pect) کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ معاہدے انصاف اور اخوت کے اخلاقی اصولوں پر ہونے چاہییں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ معاہدے کامیاب رہے اور عام لوگ خوف و ہراس کی بجائے امن و سکون کی فضا میں زندگی بسر کرتے رہے، اضطراب اور بدامنی کا زمانہ جو تقریباً فتح مکہ تک جاری رہا، اپنے اختتام کو پہنچا، حجاز میں بدامنی کا یہ عالم تھا کہ آدمی مدینہ سے مکہ تک سفر کرتا ہوا ڈرتا تھا۔ خانہ کعبہ کے علاوہ ہر جگہ ڈاکوؤں اور لٹیروں کا خطرہ موجود رہتا، خود قرآن مجید نے اس طرف صاف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہم نے ان کے لیے حرم کو دارالامن بنایا، اس کے باہر بدامنی کا یہ عالم ہے کہ حرم کے چاروں طرف سے آدمی اچک لیے جاتے ہیں۔" (عنکبوت)

لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکیمانہ سیاست اور سعئ پیہم سے پھر وہ وقت آیا کہ آپ کی اپنی پیش گوئی پوری ہو کر رہی۔ آپ نے فرمایا تھا:- "ایک وقت آئے گا جب صنعا، یمن سے ایک محمل نشیں خاتون تنہا سفر کرے گی اور خدا کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہو گا۔" چنانچہ ایسا زمانہ آیا، ان نبوی معاہدوں کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ ان میں اخلاقی روح کام کر رہی تھی اور زندگی کے بارے میں رسول کریم نے انسان کے نقطۂ نظر کو بدل دیا تھا، لیکن ان معاہدوں کے برعکس جب کبھی تاریخ میں فاتح قوموں نے خوف خدا اور اخلاقی قدروں سے بے نیاز ہو کر مفتوح قوموں پر اپنے معاہدے ٹھونسے، تو وہ ایک دوسری خوفناک جنگ کا موجب بنے، معروف برطانوی مصنف فشر (Fisher) نے اپنی کتاب "تاریخ یورپ" میں لکھا ہے کہ دوسری عالم گیر جنگ کی ذمہ داری نازی جرمنی پر نہیں، بلکہ ۱۹۱۹ء کے "معاہدہ ورسایا" (Treaty of Versailles) پر ہے، جس کی بنیاد انصاف پر نہیں تھی۔ اس معاہدے پر تبصرہ کرتے ہوئے فشر لکھتے ہیں "جب ورسایا (Versailles) معاہدے پر دستخط ہو گئے .... ہر آدمی نے محسوس کیا کہ ایک بہترین موقعہ کو کھو دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدبرین (آنے والے) واقعات کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ نہ لگا سکے، انہوں نے بزعم خویش امن کے معاہدے پر دستخط کئے، لیکن وہ معاہدہ امن سے عاری تھا، .... انسانی فطرت ناکام ہوئی اور فتح کی مسکراتی ہوئی صبح بہت جلد ناامیدی، مایوسی اور نفرت کی دھند میں گم ہوگئی"۔ چنانچہ یہی معاہدہ جس کی بنیاد اخوت، انصاف اور احترام آدمیت پر نہیں رکھی گئی تھی، دوسری عالم گیر جنگ پر منتج ہوا، اسی سال یعنی ۱۹۱۹ء میں اتحادی طاقتوں نے ترکی پر سیورے (Sevres Treaty) معاہدہ ٹھونسا، بدقسمتی سے اس معاہدے میں بھی اخوت و انصاف کا احترام نہیں کیا گیا تھا۔ حتی کہ اٹلی کے وزیراعظم نٹی (Natti) نے اتحادیوں کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرتے ہوئے کہا:- "اب تمہیں ایشیائے کوچک میں جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا، اس جنگ میں اٹلی اپنا ایک سپاہی یا ایک پیسہ بھیجنے کے لیے تیار نہیں ہے، تم نے ترکوں سے ان کے مقدس شہر کو چھین لیا ہے، ان کا دارالخلافہ غیر ملکی قبضہ میں ہے، تم نے جس پانچ رکنی وفد کو معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے بلایا ہے، وہ ترک قوم یا ترک پارلیمنٹ کا نمائندہ نہیں ہے۔" بالآخر وہی ہوا، جس کی "پیغمبرانہ" پیش گوئی ایطالوی وزیراعظم نے کی تھی، ترکوں نے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا، اور مصطفیٰ کمال پاشا جیسے فوجی قائد نے اس معاہدے کو مسترد کرتے ہوئے ترکوں کو ایک نیا عزم، ولولہ اور امید دے کر دوبارہ میدان جنگ میں لا کھڑا کیا، مغربی اتحادیوں کے نمائندے یونان نے شکست پر شکست کھائی اور اتحادیوں کو مجبور ہو کر ۱۹۲۵ء میں "لوزاں معاہدے" پر دستخط کرنا پڑے اور ترکوں کی آزادی کو تسلیم کر لیا گیا، اگر مغربی طاقتیں ذرا خدا ترسی اور عقل سے کام لیتیں، اور جرمنی اور ترکی پر ذلت آمیز معاہدے نہ ٹھونستیں تو دنیا شاید دوسری عالم گیر جنگ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی اور ترکوں کو کئی سال تک آگ کے دریا سے نہ گزرنا پڑتا۔ ہم نے اوپر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاہدوں کا ذکر کیا ہے، جن کی بنیاد طاقت اور انسانی وقار کی بے حرمتی پر نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی، بلکہ مذہب کی عطا کردہ عالم گیر اخلاقی قدروں پر تھی، جس کی وجہ سے ملک میں امن و سلامتی کو فروغ حاصل ہوا، اور معاشرے کو قتل و غارت اور خون ریزی سے نجات ملی، اسی سلسلے کی ایک دوسری مثال سنیئے، سن ۶ ہجری میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سولہ سو ساتھیوں کے ہمراہ عمرہ ادا کرنے کی غرض سے مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے، ابھی مکہ سے کوئی تین (۳) میل کے فاصلہ حدیبیہ نامی مقام پر تھے کہ آپ کو اہل مکہ کی جنگی تیاریوں کا پتہ چلا، آپ نے انہیں پیغام بھیجا کہ میرا مقصد عمرہ ادا کرنے کے سوا کچھ اور نہیں، آپ نے اہل مکہ سے قیام امن کی بات چیت کرنے کی پیش کش بھی فرمائی؛ جسے اہل مکہ نے قیل و قال کے بعد مان لیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفت و گو کے لیے اپنے ایک نمائندہ سہیل کو بھیجا اور کہا کہ صلح کی بات چیت صرف اس شرط پر ہوسکتی ہے کہ آپ (رسول کریم) اس سال عمرہ ادا کئے بغیر واپس مدینہ چلے جائیں، جب باہمی مذاکرات کے بعد چند شرائط پر اتفاق ہوا اور معاہدہ کو مرتب کرنے کا وقت آیا تو آپ نے حضرت علی سے فرمایا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم، سے معاہدہ کی ابتداء کی جائے، جس پر سہیل نے کہا کہ "بسم اللہ" سے نہیں بلکہ عربوں کے قدیم دستور کے مطابق "باسمک اللھم" سے معاہدہ لکھا جائے، آپ نے اسے قبول فرمایا، اس کے بعد دوسرا جملہ یوں تھا کہ یہ وہ معاہدہ ہے جسے اللہ کے رسول محمد بن عبداللہ نے تسلیم کیا ہے"، اس جملہ پر پھر سہیل نے کہا کہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مان لیتے، تو پھر جھگڑا ہی کیا ہے؟ آپ صرف اپنا اور اپنے والد ماجد کا نام لکھیے، رسول کریم نے حضرت علی سے فرمایا کہ صرف میرا نام لکھا جائے اور لفظ رسول اللہ کو اپنے ہاتھ سے مٹا دیا۔ اس معاہدے پر مسلمان کبیدہ خاطر تھے اور افسردہ، مسلمان اس معاہدے کی بعض شرائط سے خوش نہیں تھے، لیکن رسول کریم پورے طور پر مطمئن تھے اور قریش کے مغرورانہ اور اشتعال انگیز رویہ پر برابر صبر و تحمل اور ضبط نفس سے کام لیتے رہے، چنانچہ آپ واپس مدینہ روانہ ہوئے، قرآن مجید کی سورۃ الفتح نازل ہوئی، اور اس معاہدے کو جس میں مسلمانوں کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی سبکی نظر آتی تھی، "فتح مبین" قرار دیا، بعد میں آنے والے واقعات نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ یہ معاہدہ مسلمانوں کے لیے خیر و برکت ثابت ہوا، نیز یہ کہ اس معاہدے میں جنگ نے امن و آشتی کے ہاتھوں شکست کھائی اور اس جیت کے لیے رسول کریم نے جس پیغمبرانہ صبر و تحمل اور حکمت و بصیرت کا مظاہرہ فرمایا، اس کے سامنے اہل مکہ کے معاندانہ رویے کو اپنے ہتھیار ڈالنے پڑے، قرآن مجید نے اہل مکہ کے اشتعال انگیز موقف کو "جاہلیت" سے تعبیر کیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے باوقار اور پر امن رویے کو اللہ کا لطف و کرم قرار دیا۔ صلح حدیبیہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ کردار کو خراج ادا کرتے ہوئے سویڈن کے معروف مستشرق ٹور اندرے (Tor Andrae) لکھتے ہیں :- "ضبط نفس، جس کا مظاہرہ (حضرت) محمد نے حدیبیہ میں کیا، ایسے ہی ایک بلند نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے غیر ضروری امور پر ذاتی توہین کو برداشت کرنے کا حوصلہ اور ہمت، یہ صفات بتاتی ہیں کہ آپ بے مثال اور منفرد اہلیت کے مالک تھے، واقعہ یہ ہے کہ آپ کی سی ذہنی برتری رکھنے والا انسان زمام کار ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، خواہ اسے کبھی لمحہ بھر کے لیے مجبوراً جھکنا ہی کیوں نہ پڑے"۔

مسلمانوں میں اخوت اور بھائی چارے کے رشتوں کو مستحکم کرنے اور بدامنی اور خون ریزی کو روکنے کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاہدے مرتب کئے، وہ تاریخ کے ایسے انوکھے معاہدے ہیں، جن میں سیاست اور اخلاق دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، ان معاہدوں سے امن و آشتی کے لیے کام کرنے والوں کو ہمیشہ نیا عزم اور حوصلہ ملتا رہے گا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ آدمی کی ذاتی انا اور جھوٹے وقار کے مسئلے نے قوموں کو جنگ کی آگ میں دھکیلا ہے، جس کا مظاہرہ ہم خود بعض ملکوں میں دیکھ رہے ہیں۔ جہاں مسلمان عوام اپنے ہی ناداں اور انا پرست رہنماؤں کے ہاتھوں موت کے سایہ میں برابر سفر کر رہے ہیں اور کوئی نہیں جو اپنی انا کے بت کو توڑ کر رسول عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نقش قدم پر چلے، اور جنگ کی ... ئے ہوئے غیر مسلمانوں ... کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیرت طیبہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ رسول کریم نے جہاں اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے لیے مثالی ضبط نفس، تدبر اور حکمت سے کام لیا، وہاں آپ نے اپنے گردوپیش کے حالات اور ان کی نزاکت کو بھی نگاہ میں رکھا، صحیح بخاری کی ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ خانہ کعبہ کو ڈھا کر اسے ازسرِنو تعمیر کرنا چاہتے تھے، لیکن آپ نے ایسا نہیں فرمایا۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے کفر سے منہ موڑنے والے نیے نیے لوگ کسی "فتنے" کا شکار ہو سکتے تھے۔ آپ نے اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عائشہ سے فرمایا :- اگر کفر سے تمہاری قوم کا (قطع) تعلق نیا نیا نہ ہوتا (یعنی کفر سے رشتہ توڑے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری) تو میں خانہ کعبہ کو ڈھا دیتا اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں پر (دوبارہ) تعمیر کرتا۔ کیوں کہ قریش نے خرچ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بنیاد مکمل نہیں کی تھی اور اس کا (صرف) پچھلا دروازہ بنایا تھا۔" (۱۰)

حالات حاضرہ پر آپ کی گہری نظر کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ غزوہ بنی مصطلق میں عبداللہ بن ابی (منافقین کا سردار) نے آں حضرت اور مسلمانوں کے بارے میں رکیک باتیں کیں، آپ کو جب علم ہوا، تو آپ نے مسلمانوں کو ایسے وقت میں کوچ کرنے کا حکم فرمایا، جس میں آپ عموماً کوچ نہیں فرمایا کرتے تھے۔ راہ میں جب ایک آدمی نے اس کی وجہ پوچھی، تو آپ نے اسے عبداللہ بن ابی کا واقعہ سنایا، القصہ مسلمانوں کا یہ قافلہ ساری رات اور دن سفر میں رہا۔ دوسرے دن جونہی پڑاؤ کیا تو لوگوں پر (جو تھکے ہوئے تھے) نیند طاری ہو گئی، رسول کریم نے یہ کوچ ایسے "نامناسب وقت" (ساعۃ منکرہ، بہ روایت ابن ھشام) میں اس لیے فرمایا کہ لوگوں کی توجہ کو عبداللہ بن ابی کے (ناخوشگوار) واقعہ سے ہٹا دی جائے۔" (۱۱)

ان واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ رسول کریم نے ہر لمحہ جنم لینے والے نیے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انتہائی احتیاط، تدبر اور بصیرت سے وقت کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے۔ اس سے مسلمانوں اور تمام انسانوں کو برابر رہنمائی ملتی رہے گی، کیوں کہ روح عصر،

© rasailojaraid.com